Iqbal Review (64: 1)
(January - March 2023)
ISSN: (P)0021-0773
ISSN: (E)3006-9130

ساقی نامہ

احمد جاوید

Saqi-nama is a sub-genre of Masnavi. Allama Iqbal used this genre in its original technical system and started a tradition by changing its traditional content. Earlier Saqi Nama used to be God-centred, but Allama Iqbal made it human-centered. In other words, Allama Iqbal has described the subjects related to human reality in Saqi Nama. Allama Iqbal has also mentioned the phenomena of nature in Saqi Nama but has given them a new meaning. It seems that in his poetic scenario, the earth has risen from its level and has become heaven. Throughout the poem, Allama Iqbal moves from one major subject to another major subject so skillfully as if the reader moves from one world of meaning to another universal reality without feeling any distance. Each word of Saqi Nama has a universal meaning. In it, we see the inner light of life, the knowledge of reality and the continuous abundance of Divine Love in the universe at every step.

پچھلے دو بند تاریخ کے بند تھے، اب اگلا بند ایک ایسے اُصول کا بیان ہے جو تاریخ کی بھی بنیاد ہے، انسان کی بھی اصل ہے وہ کیا ہے؟ وہ ہے زندگی۔ جس طرح تاریخ انسان کی نگرانی میں کائنات کی صلاحیتوں کا اظہار ہے۔ تو آپ وہ کائنات اور انسان کے درمیان پائی جانے والی دوئی کو ایک اُصولِ وحدت پہ ختم کر رہے ہیں، وہ اُصولِ وحدت کیا ہے، حیات۔ حیات کائنات اور انسان کی مشترکہ واحد بنیاد ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان حیات پر تصرف رکھتا ہے اور کائنات حیات کے آگے انفعالی حیثیت رکھتی ہے۔ حیات انسان میں فاعلی حیثیت میں ہوتی ہے اور انسان کی فعالیت کا نام ہے اور کائنات کی ایک حفاظتی انفعالیت کا نام ہے۔ تو اب اس کو یہ جوڑ رہے ہیں۔ اب یہ بتائیں گے کہ زندگی کیا ہے یعنی کائنات اور انسان کی ماہیت کی واحد بنیاد کیا ہے۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اِک شے سے پیدا رمِ زندگی

آپ اس کی آواز پر غور کریں تو یہ جیسے یمِ زندگی کی روانی کو آواز نے ہی پہلے پکڑ لیا ہے۔ کہتے ہیں انسان اور کائنات دونوں جو کچھ ہیں وہ سب کچھ زندگی کے سمندر کی روانی سے پیدا ہونے والی موجیں ہیں۔ تو ہمارا پورا اسلوب زندگی کی حرکت سے پیدا ہونے والی موجیں ہیں۔ ''دما دم رواں ہے یمِ زندگی ہر اِک سے شے پیدا رمِ زندگی''۔ اس کا پہلا مصرع آواز کے اعتبار سے بہت کمال کا ہے اور دوسرا مصرع معانی کے اعتبار سے بہت مکمل ہے کہ 'ہر اِک شے سے پیدا رمِ زندگی' اس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت قانونِ وجود ہے۔ حرکت آئینِ ہستی ہے تو شے کا مطلب ہے موجود۔ تو جو بھی موجود ہے وہ دراصل زندگی کا ظرفِ حرکت ہے۔ جب تک زندگی کی حرکت کا ظرف اور انعکاس کرنے والی چیز نہیں بنے گی اس وقت تک وہ ہونے کی تعریف پر پوری نہیں اُترے گی۔ رم حرکت کو کہا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ اس یمِ زندگی کو ایسا نہ سمجھو۔ سا کی حرکت عالمگیر اور انفسِ گر ہے۔ انفس بھی اسی پہ کھڑا ہے آفاق بھی اسی پر استوار ہے۔ ہر اِک شے سے پیدا رمِ زندگی۔

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

بدن ہر مادی شے ہے۔ یعنی ہر شے مادہ ہے اور ہر شے جسمانی ہے۔ یہاں ''موجِ دود'' بدن کو کہا ہے کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود۔ کہ زندگی میں بدن اسی طرح سمایا ہوا تھا جس طرح دھواں شعلے میں سمایا ہوا ہوتا ہے تو شعلہ اس کو ظاہر کرتا ہے۔ شعلہ نہ ہو تو دھوئیں کی موت یعنی بدن ظاہر نہ ہوتا۔ اس طرح سے یہ نظامِ اظہار ہے۔ اس تشبیہ میں بہت نادر خوبصورتی ہے کہ کسی نے بدن کو موجِ دود نہیں کہا جو دھوئیں کی لہر ہے اور زندگی شعلہ ہے جس میں عشق کی حرارت اور عقل کا جلال یکجا ہے۔ تو بدن اس کے ساتھ بس وہی نسبت رکھتا ہے جو دھوئیں کی نسبت ایک شعلۂ جوالہ سے ہوتی ہے یعنی بدن زندگی کا پست ترین اظہار ہے۔

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

اب کیونکہ آب و گل یعنی بدن یعنی موجِ دود یعنی ہستی کی مادی سطح یا مادی مرتبۂ وجود وہ جس کی لطافت، جس کی شان، جس کے شکوہ کے خلاف ہے لہٰذا یہ آب و گل سے نسبت اس پر گراں ہے۔ یہ زندگی آب و گل کے ساتھ منسوب ہونے سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ مادے کے ساتھ زندگی کا تعلق خود زندگی کے مزاج کی روشنی میں ناگوار ہے لیکن اس میں مادے کے اندر حرکت لانے اور مادے کو زندہ کرنے کی جو

ایک رَو ہے وہ رَو اس کو اچھی لگی۔ یعنی ہستی کی پست ترین سطح کو بھی اپنی نسبت سے مشرف کر دینا اس کو پسند آ گیا۔ ''محنت'' یہاں بہت بامعنی لفظ ہے اور بہت پھسلواں بھی ہے۔ محنت کا یہاں وہ مفہوم نہیں ہے جو عام اُردو زبان میں محنت سے لیا جاتا ہے۔ محنت کہتے ہیں غم کو، محنت کہتے ہیں قید کو۔ محنت کہتے ہیں ناگوار مشقت کو۔ مادے میں سمائے ہوئے، زندگی ان تینوں کا سامنا کر رہی ہے۔ مادے سے نسبت پیدا کرتے ہوئے لیکن کیونکہ زندگی بعض نتائج آب وگل سے نکالنے میں کامیاب ہے لہٰذا اسے بہت اُتر کر مٹی سے رشتہ پیدا کرنا راس آ گیا ہے۔ خوشگوار نہیں ہے لیکن بارآور ہے۔

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

اب بدن کے ساتھ نسبت بتا دی۔ بدن کے اُصول ہیں عناصر۔ بدن، عناصر کی بنیادوں پر بننے والا سانچہ ہے۔ عنصر کسے کہتے ہیں؟ عنصر کی تعریف کیا ہے! عناصر اربعہ کہتے ہیں یا عناصر چہار کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ مادے کے اجزائے ترکیبی ہیں کہ مادہ ان چاروں سے مل کر بنا ہے۔ تو اب کہہ رہے ہیں کہ یہ مادے سے معاملہ کرنے میں کامیاب ہونے کے باوجود یہ مادیت میں کھپ نہیں سکتی۔ یہ ہمیشہ بلند رہے گی اور مادے کی ہمیشہ یہی ایک بنیادِ تخلیق ہے۔ تو کہتے ہیں کہ مادے کی بنیاد ہوتے ہوئے بھی یہ مادے سے ایک دوری رکھتی ہے[1] بیزاری کے ساتھ کیونکہ مادے کا کام کیا ہے یا پستی کی سب سے خطرناک صفت کیا ہوتی ہے۔ گراوٹ کا سب سے بڑا خطرہ کیا ہوتا ہے۔ یہ چیزوں کو نگل جاتا ہے۔ مادے میں ذرا غلطی ہو جائے تو یہ زندگی اور اس کے حقائق کو گویا مادی بنا دے گا، اپنے جیسا بنا دے گا تو اس لیے اسے پھندہ کہا ہے۔ عناصر کے پھندوں کی گراوٹ آدمی کو اوپر اُٹھ کے بلندی تک پہنچانے کی بجائے بلندی پر واقع مقاصد کو بھی اپنی گرفت میں لینے پر کمربستہ رہتی ہے۔ یہ بلند مقاصد کو گرے ہوئے مقاصد بنا دیتی ہے، یہ بلند کو بھی پستی میں ڈھال دیتی ہے تو اس وجہ سے زندگی اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہوئے بھی اس تعلق کو رغبت کی قوت سے نہیں چلاتی بلکہ بیزاری کی طاقت سے چلاتی ہے اور یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی۔ یہ ثابت یعنی ٹھہری ہوئی بھی ہے اور سیار بھی اور عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عناصر میں ٹھہری ہوئی ہے اور اپنی قوتِ سیاری سے یہ عناصر سے نکلی ہوئی بھی ہے:

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں، بے نظیر

پھندے کی رعایت سے فوراً دوسرے مصرعے میں اسیر آیا ہے۔ وحدت کیا ہے، زندگی اپنی ساخت میں وحدت کا نام ہے، اپنے اظہار میں کثرت سے عبارت ہے تو گویا زندگی کثرت میں پائی جاتی ہے۔ زندگی

وحدت میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ تو گویا وہ کثرت کی قید میں ہے، کثرت نے اُسے اسیر کر رکھا ہے۔ تو زندگی صرف ذہن میں واحد ہے ظہور میں کثیر ہے۔ زندگی صرف اپنی ذات میں واحد ہے،[۲] اپنے اظہار کے ہر ہر مرحلے میں کثیر ہے۔ تو اس کو وہ ایک شاعرانہ انداز سے کہہ رہے ہیں کہ یہ وحدت کثرت میں مستقلاً اسیر ہے لیکن اس اسیری کے باوجود ہر جگہ بے مثل ہے اور بے نظیر ہے۔ اب اس کے معانی دو نکلیں گے:

وحدت کا جو مایۂ اصلی ہے وہ وحدتِ ربانی ہی ہے چاہے وہ وحدت مخلوق کو بھی ودیعت ہے اگر کہیں۔ ہم مخلوق میں بھی وہ وحدت دیکھیں گے تو اس کا جوہر ہمیشہ وحدتِ ربانی ہوگا اور اسی وجہ سے وہ اصطلاحیں بھی وہ استعمال کر رہے ہیں جو ذاتِ حق کے لیے ہوتی ہیں بے چگوں اور بے نظیر۔ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ وحدت گو کہ کثرت میں اسیر نظر آتی ہے لیکن یہ کثرت میں سمائے ہوئے ہونے کی حالت میں بھی کثرت سے بلند ہوتی ہے اپنی بے نظیری اور اپنی بے مثلی کی وجہ سے۔ وحدت کی تعریف کیا ہے، وحدت کہتے ہیں بے چگونی اور بے نظیری کو۔ اس جیسا کوئی نہ ہو اس سے ملتا جلتا کوئی نہ ہو اور اس کو سمجھ کی گرفت میں لانا بھی محال ہے۔ اب اس میں ایک مشکل ہے، اس کے لیے ذرا سا تیار ہونا چاہیے۔ بے چگوں اور بے نظیر، یہاں کلیدی الفاظ ہیں اور یہ ہم مقصد ہیں، ہم معانی نہیں ہیں۔ ہم مقصد سے مراد یہ ہے کہ جو بھی بے چگوں ہوگا وہ بے نظیر یقیناً ہوگا۔ جو بھی بے نظیر ہوگا وہ لازماً بے چگوں بھی ہوگا۔ یہ تو ہوا مقصد میں لیکن اپنے معانی میں یہ ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہیں۔ سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ایک دم اس کا بہت بڑا دائرہ بن جائے گا۔ بے چگوں اُسے کہتے ہیں جو شعور میں واحد ہو، زندگی میں ظاہر ہو۔ بے نظیر جو وجود میں واحد ہو۔ زندگی شعور میں بھی واحد ہے، زندگی وجود میں بھی واحد ہے۔ بے چگوں کہتے ہیں جس کے بارے میں یہ نہ کہا جا سکے کہ وہ کیسا ہے۔ بے نظیر اسے کہتے ہیں جس سے ملتا جلتا کوئی اور نہ ہو۔ تو اس وجہ سے ''یہ کیسا؟'' شعور کا سوال ہے اور 'ملتا جلتا' وجود یہ ہستی کا سوال ہے۔ جسے Define نہ کیا جا سکے وہ بے چگوں ہے اور جسے تقسیم نہ کیا جا سکے وہ بے نظیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شعر زندگی کا 'غیر' دریافت نہیں کر سکتا۔ وجود زندگی کا مماثل نہیں رکھتا۔ موجودات میں اس کا کوئی مماثل نہیں ہے اور معلومات میں اس جیسا کوئی اور معلوم نہیں ہے۔ نہ اس جیسا کوئی معلوم ہے یعنی وہ بے چگوں ہے نہ اس جیسا کوئی موجود ہے یعنی بے نظیر ہے۔ بے چگونی اور بے نظیری تنزیہ محض pure transcendence ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ زندگی اپنی اصل میں منزہ اور ماورا ہے اور اپنی فعلیت میں پوری تشبیہ immunance ہے۔ تنزیہ اور تشبیہ یہ زندگی کے دو اصول ہیں۔

یہ عالم، یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

یہاں بت خانہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات عالم صور ہے اور یہ اپنی صورت کو حقیقت کا بدل بنا لیتی

ہے۔ بت خانہ اسے کہتے ہیں جہاں صورت کو ماورائے صورت پر ترجیح دی جائے۔ جہاں صورت سے ماورا اس سے بلند کچھ نہ مانا جائے۔ اس کو کہتے ہیں بت خانہ۔ لیکن اتنی ہی بات نہیں ہے، یہ تو ابھی ہلکی بات تھی۔ ''یہ بت خانہ شش جہات'' اگر اس سے اوپر نہ اُٹھا جائے تو کائنات میں کیا جانے والا ہر عمل بت پرستی ہے اگر اس سے اوپر..... یعنی ساتویں جہت میں جائے بغیر آپ اس دنیا میں جو بھی کام کریں گے وہ بت پرستی ہے۔[۳۳] وہ حق سے دوری ہے اور شش جہات کی خوبصورتی دیکھیں کہ ایک شش پہلو، چھ ابعاد والا یہ شش جہاتی عالم مادی؟

کائنات hexagonal معبد ہے۔ اب دیکھنے میں کیسی لگ رہی ہے اتنی بڑی تمثیل بنے گی کائنات کی۔ بالکل بصری تمثیل ہے۔

شش جہات یعنی چھ سمتیں دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے۔ تو یہ گویا عالم مکان ہے۔ مکانیت سمتوں کے گھر کو کہتے ہیں جہاں ہر چیز کسی رُخ پر رکھی ہوئی ہے اسے کہتے ہیں شش جہات۔ جہاں ہر چیز کا ایک زاویہ، ایک جہت، ایک سمت ہونا ضروری ہے۔ مکانیت کی شرط کیا ہے کہ ہمارا کوئی رُخ ہو، کوئی زاویہ ہو، کوئی جہت ہو تو ان معنوں میں اس کائنات میں موجود ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی جہت میں ہوں۔ تو 'اُسی نے تراشا ہے یہ سومنات۔' 'اسی' کا مطلب ہے زندگی نے تراشا ہے کہ یہ کائنات بت خانہ ہے۔ اور دیکھو عجیب بات ہے۔ یہ بت خانہ بھی زندگی ہی کا بنایا ہوا ہے۔ اس بت خانے کی تعمیر کعبے کی اینٹوں سے ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے ایک پوری سوچ، ایک نظام ہے۔ صورت کو اس سے جوڑنا امتحان ہے۔ جو صورت سے ماورا ہے، منزہ عن المادہ وصورت ہے تو زندگی یہ امتحان گاہ بناتی ہے ہمارے لیے۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

یہاں تکرار کا مطلب ایک جیسی چیزیں پیدا کرنا ہے۔ کہتے ہیں زندگی نادرہ کار انفرادیت ساز ہے۔ زندگی اپنی اساس میں واحد، اپنے آثار وفعلیت میں کثیر اور اپنے مقاصد میں وحدت گر ہے۔ زندگی خود واحد، اس کا اظہار کثرت میں نہیں ہوتا ہے لیکن کثرت میں اظہار کر کے وہ اپنے مزاجِ وحدت کو بھی ظاہر کرتی ہے تو کثرت کا ہر مظہر، آثار کثرت میں ہر ایک منفرد ہے۔ اس کثرت کے ہر ظہور میں ایک امتیاز اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ہر چیز کی تعریف ہم دو طرح سے کرتے ہیں، تین مرحلوں میں کرتے ہیں۔ اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ چیز اصل میں کیا ہے؟ تو زندگی اصل میں وحدت ہے۔ یہ چیز فعلیت میں کیا ہے؟ اس کا اسلوبِ فعل کیا ہے۔ تو یہ اپنی فعلیت میں کثرت کی خالق ہے اور اس کا مقصد اور غایت کیا ہے؟ تین مراحل چاہئیں تعریف، تحسین کے لیے۔ اس کا مقصود اور غایت یہ ہے کہ کثرت کو بھی وحدت کی اصل پہ

بنایا۔ کثرت وحدت کی اصل سے حالت ظہور میں جڑی رہے۔ کثرت کو دلیل وحدت بنانا یہ زندگی کا مقصد ہے۔ تو کثرت کو دلیلِ وحدت آپ کیسے بنائیں گے۔ کثرت کا مطلب ہے جہاں وحدت نہ پائی جائے۔ تو اب کثرت کو اپنی جگہ دلیلِ وحدت بنانا یہ کتنا بڑا کام ہے۔ اس کثرت میں ہر شے کو منفرد اور ممتاز بنا کر کس طرح زندگی بناتی ہے۔ یہ کثرت سو اشیاء، سو محل ظہور کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے کوئی محل ظہور ایسا نہیں ہے کہ اس جیسا کوئی دوسرا محل یا دوسری شے پائی جائے۔

بے چگونی نہیں ہے تو اب کہہ رہے ہیں کہ اس کو تکرار پسند نہیں ہے اور اس کا اظہار دیکھ لو کہ کتنا واضح ہے کہ میں تم نہیں ہو سکتے اور تم میں نہیں ہو سکتے۔ ہم دونوں عالم کثرت کی اشیا ہیں لیکن مَیں مَیں ہوں، آپ آپ ہیں۔ تو میرا مَیں ہونا اور آپ کا آپ ہونا، زندگی اس طغیانِ کثرت میں بھی پوری طرح محفوظ رہتی ہے تا کہ وحدت کا مزاج اور وحدت کا عرفان پیدا ہو جائے۔ آپ کبھی غور کریں کہ کثرت کا تجربہ وحدت کی معرفت تک پہنچاتا ہے۔ یعنی شعور کی بناوٹ ایسی ہے کہ وہ پچاس چیزوں کو دیکھ کر ایک صورت دے دیتا ہے۔ یہ فطری ہے یہ زندگی کا فطری نظم ہے کہ کثرت اپنے تمام آلات و آثار کے ساتھ وحدت کی طرف اشارہ کرنے والا واحد ذریعہ اور وسیلہ بن جائے۔

من و تُو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

اب اس کی تفصیلات بتا رہے ہیں کہ زندگی کی رونق ہی من و تو کی مجلس سے ہے۔ کثرت یعنی diversity کو زندگی اپنی رونق اور اپنی زینت بنانے کے باوجود اس چمک دمک سے خود کو بلند رکھتی ہے۔ زندگی اپنی بنائی ہوئی محفل میں خلوت نشیں رہتی ہے۔ صوفیوں کے ہاں ایک مقولہ ہے 'خلوت در انجمن'۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یکسوئی خدا کی طرف ہو اور قیامِ انجمن میں ہے۔ تو زندگی کا یہی معاملہ ہے کہ اس میں اسلوبِ تشبیہ اور اُصولِ تنزیہ متوازی چلتا رہتا ہے۔ یہ اپنے اُصولِ تنزیہ میں یعنی اپنی اصلیت میں ہمیشہ اکیلی ہے۔ اور یہ اپنے اسلوبِ اظہار میں، تشبیہ میں ہمیشہ انجمن آفریں ہے یعنی اپنی خلوت کو برقرار رکھتے ہوئے انجمن بناتی ہے پیدا کرتی ہے۔ یہاں انجمن آفریں کہا ہے یعنی انجمن بناتی ہے۔ کثرت کی موجد ہے وحدت میں غرق رہتے ہوئے اپنے آپ میں منہمک رہتے ہوئے اپنے غیروں کے درمیان رہتی ہے۔ اپنی وحدت کے ذوق میں اپنی وحدت کو روشن رکھتے ہوئے کثرت کے تقاضے پیدا کرتی رہتی ہے۔ کثرت کو بقا دیتی رہتی ہے اپنی قوتِ وحدت سے۔

چمک اس کی بجلی میں، تارے میں ہے
یہ چاندی میں، سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں، اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے پھول

تو اب یہ جیسے ایک خطیبانہ شاعری چل رہی ہے کہ ہر چیز میں اسی کا ظہور ہے۔ ہر چیز اسی کی ہے اور:

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہسار کائنات کی طاقت کا مظہر ہے۔ یعنی کائنات میں جتنی رفعت، قوتِ شوکت پائی جاتی ہے اس کی علامت کہسار ہے پہاڑوں کی جگہ۔ تو کہتے ہیں کہیں اپنی قوت سے یہ کائنات کو فتح کرتی ہے کہیں اپنی طاقت سے یہ کائنات کو مطیع بناتی ہے اس کی تمام تر وجودی سکت کے ساتھ۔ اور ''کہیں اس کے پھندے میں جبریل وحور'' یہ عالم خلق پر حاکم ہے اور عالم امر کی فاتح ہے۔ زندگی کا سکہ صرف عالمِ خلق میں نہیں چل رہا بلکہ عالم امر بھی اس کے زیرنگیں ہے۔ امر وخلق کا فرق کیا ہے؟ امر وخلق اصطلاحی معنوں میں دو دُنیائیں ہیں۔ جو دُنیا اللہ نے کثافت کے بغیر پیدا کی ہے وہ عالم امر ہے اور جو دنیا مادی ہے جس میں مادہ درکار ہو وہ عالم خلق ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ روح اور مادے دونوں پر حاکم ہیں۔ زندگی روح اور مادے دونوں پر حاکم ہے۔ زندگی عالمِ انسانی اور عالمِ الٰہی دونوں پر حاوی ہے۔ دونوں کی بادشاہت اس کے ہاتھ میں ہے۔ دونوں کا مصدر ومرکز وہ ہے۔ دونوں کا سبب اصلی ہے۔ جس زندگی سے یہ پتا موجود ہے۔ زندگی ہی سے جبریل بھی موجود ہے۔ تو اس کے مظاہر کائنات بھی ہیں، انسانی بھی ہیں، انفسی بھی ہیں، آفاقی بھی ہیں اور روحانی اور الٰہیاتی بھی۔ اب اس کو علمی رنگ میں کہیے تو زمان ومکاں سے بنی ہوئی دُنیا بھی اسی کی ہے اور کون ومکان سے وراء، زمان ومکان سے بلند مرتبہ بھی اسی کا ہے۔ اور جبریل وحور کو ایسا نہ سمجھیے کہ یہ کوئی قافیہ نہیں ہے۔ ''جبریل اور حور'' اس عالم کے دو قطبین ہیں اس کو سمجھ لیجیے۔ اس عالم میں رہنے کا ادب عاشق بننا ہے۔ اُس عالم میں رہنے کا ادب محبوب بننا ہے تو اُس عالم میں محبوب کی شان بھی زندگی دیتی ہے اور اس عالم میں عاشق ہونے کی توفیق بھی زندگی ہی سے ملتی ہے۔ حور محبوب کا صیغہ ہے اور حور کیا ہے۔ حور جمالِ حق کا مظہر ہے۔ جبریل جلال حق کا مظہر ہے۔ جبریل کو قرآن میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے مولیٰ ہیں۔ جلال و جمال کے اُصول پر عالم چل رہا ہے۔ وہاں علم اور عشق کے کردار جبریل اور حور ہیں۔ عشق کی قدر حور اور علم کی اصل جبریل ہے۔

کہیں جرۂ سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

اب یہ اس کا دوسرا شعر بھی ملا کے پڑھیں گے۔ یہ بتا رہے ہیں کہ عالم کثرت کیونکہ عالم ضد ہوتا

ہے، کثرت کی دنیا کا مزاج جدلیاتی ہوتا ہے۔ یہاں چیزیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوکر ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرتی ہیں۔ یہ جیسے ہیگل نے بہت اچھا کہا ہے۔ کائنات کا pattern، dialectical ہے اور یہاں کی حرکت Thesis, anti-thesis اور synhthesis ہے۔ کہ دو چیزیں ٹکرا کے تیسری چیز کو جنم دیتی ہیں۔ تو یہاں جتنی بھی تخلیقیت پائی جاتی ہے وہ دو چیزوں کے آپس میں ضم ہونے سے نہیں دو چیزوں کے گتھم گتھا اور دست و گریباں ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ یہ دُنیا، یہ عالم ضد ہے۔ جدل اس جہان کا وہ وصف ہے کہ جو شاہین ہے، جو فاتح ہے وہ بھی زندگی ہی کا مظہر ہے اور وہ جو شاہین کے چنگل میں آ کے اپنی جان سے جاتا ہے وہ بھی زندگی ہی کا مظہر ہے۔ اس دنیا میں جینے والا بھی زندگی کا ظہور ہے اور مرنے والا بھی زندگی کا اظہار ہے۔ یعنی کہ تمام اضداد ہیں وہ فنا کی حالت میں بھی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور غلبہ پا کر بھی زندگی ہی کی دلیل بنتے ہیں۔ جرہ شاہین کی ایک قسم ہے جو نایاب ہوتی ہے۔ یہاں جرہ اصیل کے معنی میں ہے یعنی جیسے اصیل مرغ، یعنی جو بہت نایاب ہو۔ تو جرہ شاہین سیماب رنگ کیوں کہا کہ سفید شاہین نایاب ہوتا ہے کہ 'شاہوں کو بھی ملتا نہیں شاہینِ کافوری'۔ تو شاہینِ کافوری اور شاہین سیماب رنگ ایک ہے یعنی سفید رنگ۔ پہلی مناسبت تو یہ کہ جرہ اور سیماب اس کے رنگ سے بھی مشابہت رکھتا ہے اور اس کی طبیعت بھی اس میں سمٹ آئی کہ ہر وقت متحرک رہے گا۔ یعنی سیمابیت کہتے ہیں اس طاقت کو جو حرکت انتہائی طاقت کے ساتھ ہو۔ اس کو کہتے ہیں سیمابیت۔ سیمابی وہ ہے جس کی حرکت پر قابو نہ پایا جاسکے۔ جس کی حرکت کو کوئی دوسری قوت روک نہ سکے۔ اور یہاں رنگ کے بھی دو معانی ہیں۔ ایک تو ظاہری معنی۔ سیماب رنگ کا مطلب ہے سفید۔ اور رنگ کا یہاں مطلب مزاج بھی ہے۔ کہ سیماب کی رنگت بھی لے لی اور سیماب کا مزاج بھی اسی شاہین میں جمع ہے: ''لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ'' جس کا پنجہ چکوروں کے خون سے رنگین۔ یہ منظر ہے اور اس منظر کی خوبصورتی دیکھیں بالکل سفید شاہین ہے اور اس کے پنجے سرخ ہیں۔ تو یہ بڑا خوبصورت لگے گا۔ سرخ اور سفید میں تقابل ہے۔ اس سے تضاد کا پہلو بھی نکال کے دکھایا:

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

اور یہی زندگی جو وہاں شاہین سیماب رنگ ہے، یہاں کبوتر ہے جو اپنے آشیانے سے دور کسی جال میں پھنسا ہوا تڑپ رہا ہے۔ یعنی زندگی جو آدابِ فتح بھی سکھاتی ہے جو مزاج شکست کی بھی بانی ہے۔ اس سے زندگی کی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ ایک فقرے میں آپ سے عرض کروں کہ زندگی وہ وحدت ہے جو اضداد میں ظاہر ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی مقابل، اس کی کوئی ضد نہیں ہے

اور ہر مجموعۂ اضداد زندگی کی تخلیق ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

آپ اس کو بھی ذرا شاعری سمجھ کے پڑھیے: ''ناصبور'' پھڑکنا اور اس سے جڑا ہوا شعر کہہ دیا کہ یہ پھڑکنے کو دیکھو تو اس کو تحقیر کی نظر سے اور بے وقوفی کی نگاہ سے نہ دیکھو کیونکہ یہی حقیقت ہے۔ اس کا تڑپنا اور پھڑکنا یہی حیات ہے اور تمہارے ذہن میں سکون و ثبات کا جو تصور ہے یا سکون و ثبات کا جو خاکہ تم نے اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے وہ نظر کا دھوکہ ہے اور کچھ بھی نہیں یعنی ٹھہراؤ اور قیام دھوکہ ہے۔ حرکت اور تڑپ ہی حقیقت ہے۔ فریب نظر کی ایسی تعریف اس مصرعے میں دے دی ہے کہ آپ لغت میں نہیں ڈھونڈ سکتے۔ چار لفظوں کا تو یہ مصرع ہے۔ اس میں فریب نظر کی تعریف متعین کر دی۔

فریب نظر کہتے ہیں کہ آنکھ دیکھ رہی ہے اس چیز کو جو ہے ہی نہیں۔ یا آنکھ ایک چیز کو دیکھ کے بالکل مختلف معانی پہ یقین دلوا رہی ہے تو یہ فریب نظر ہو گیا۔ یہ تو عام بات ہے۔ لیکن اس میں ایک عجیب رنگ ہے۔ یہاں نظر دو معانی میں ہے: نظر خیال اور فکر کو بھی کہتے ہیں اور نگاہ کو بھی۔ نظر یوں سمجھ لیں وہ دید ہے جو آنکھ سے ہوتی ہے اور دماغ سے بھی ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھے کہ تیری بینائی بھی فریب میں مبتلا ہے اگر تو یہاں کھڑا ہوا ہے اور تیرا خیال بھی ایک دھوکہ ہے۔

نظر کے دو معانی ہیں۔ بصیرت کا دھوکہ بھی فریب نظر۔ بصیرت کیا چیز ہے معانی کو دیکھنا۔ بصارت کیا ہے صورت کو دیکھنا۔ کہ تو جو معانی میں، تصور میں، سکون و ثبات سمجھ رہا ہے وہ بھی دھوکہ ہے اور جو تو آنکھوں سے سکون و ثبات دیکھ رہا ہے وہ بھی دھوکہ ہے۔ سب سے مکمل دھوکہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے مکمل دھوکہ یہ ہوتا ہے جو ہونے میں بھی دھوکہ ہو اور تصور میں بھی فریب ہو۔ یہ کہہ رہے ہیں سکون و ثبات خارج میں بھی دھوکہ ہے اور ذہن میں بھی فریب ہے۔ سکون جمودی ہے۔ ٹھہراؤ اور ثبات کا مطلب ہے قیام یعنی ٹھہرا رہنا۔ ثبات ایک مثبت معنی میں ہے سکون منفی معنی میں ہوتا ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ سکون و ثبات کو کوئی خارج میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ تو آنکھ سکون و ثبات کا منظر کبھی نہیں دیکھتی۔ تو اب یہ کہہ رہے ہیں کہ فریب نظر اس تصور کو کہتے ہیں جو ذہن اپنے واہمے سے تراش لیتا ہے۔ سکون و ثبات کا تیرے ذہن میں ایک واہماتی تصور ہے وہ فریب نظر ہے۔ تو اپنے ذہن میں جس سکون و ثبات کو دیکھ رہا ہے وہ ذہن میں موجود حقیقی تصورات کے مقابلے میں دھوکہ ہے اور فریب نظر کی تعریف یہ ہے کہ چیزوں کو خارج میں نہ دیکھ سکنا اور صرف ذہن میں دیکھنا۔ یہ تعریف اقبال نے دی ہے۔ فریب نظر یہ ہے کہ جو چیز میں دیکھ رہا ہوں وہ مجھ سے باہر نہیں پائی جاتی بلکہ میرے دماغ ہی میں نقش ہے۔ 'تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات' اب آپ

ذرا اس کو اس مصرعے کو چشم تصور میں لایئے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کے پاس خلا کی ایسی ایسی تصویریں ہیں کہ دیکھنے سے ہیبت طاری کرتی ہیں اقبال کے زمانے میں یہ کہاں تھیں! لیکن آپ دیکھیے کہ ایک مکمل لفظی اظہار، ایک انتہائی آسمانی دید سے زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ یعنی ان کا لفظی بیان آپ کی دیکھی ہوئی چیز سے زیادہ مکمل ہو، یہ بڑی بات ہے۔ اب ذرا سا غور کیجیے۔ کس تصویر میں آپ اس مصرعے کو مکمل کر کے دکھا سکتے ہیں۔ اس کی ذرا تصویر بنا لیجیے کہ کائنات کا ہر ذرہ تڑپ رہا ہے یہاں سے لے کر ایک ارب نوری سال کی دوری پر بھی۔ جو چیز دس ارب نوری سال کے فاصلے میں پائی جانے والی چیزوں کو ایک ہی اُصولِ حرکت سے باندھے ہوئے ہے وہ زندگی ہے۔ تڑپنے کا کیا مطلب ہے، تڑپنا وہ ہوتا ہے جو ختم بھی ہوتا ہے۔ یعنی کائنات کا نظام یہ ہے کہ حرکت میں رہو ورنہ مر جاؤ۔ حرکت اور فنا۔ دونوں تڑپنے میں آ گیا۔ ہر ذرہ جب تک تڑپتا ہے اور تڑپ رُکتے ہی اپنی جگہ خالی کر جاتا ہے۔ تو سکون کیا ہے، سکون حرکت کا الٹ ہے اور ثبات فنا کی ضد ہے۔ ہر ذرہ حرکت اور فنا کا مجموعہ ہے۔ کائنات بس اسی گونج سے گونج رہی ہے یعنی حرکت اور فنا۔ تو تڑپنے میں حرکت اور فنا دونوں شامل ہیں۔ غور کیجیے تڑپنا آخر میں ختم ہوتا ہے۔ تو تڑپنا جہاں ختم ہوتا ہے وہ فنا ہے۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

یہاں اقبال وجود اور زندگی کو ہم معانی بنا کے استعمال کر رہے ہیں۔ وجود کا مطلب بھی زندگی لینا چاہیے، گو کہ وجود اور زندگی کے معانی میں فرق کیا جاتا ہے۔ تو کہہ رہے ہیں زندگی اور ہستی کا قافلہ کہیں رُکتا نہیں ہے اور 'ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود'۔ یہاں ''شان'' کا لفظ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ''شان'' کا مطلب اظہار بھی ہے اور شان کا مطلب فعل بھی ہے۔ وجود حرکت مسلسل کا نام ہے اور اس تسلسل کا ایک ایک لمحہ دوسرے لمحات کے مقابلے میں مختلف، ممتاز اور منفرد ہے۔ یعنی وجود اگر ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی حرکت ہے تو اس حرکت کا ایک ایک نکتہ دوسرے نکتے سے الگ ہے۔ وہ پچھلے نکتے کی تکرار نہیں ہے۔ تو یہاں اقبال نے زندگی کو وجود کے لفظ سے تعبیر کر کے اس میں ایک الوہی فضا پیدا کر دی ہے وہاں جو شان کے معنی ہیں وہ یہاں وجود میں دکھائے ہیں۔ تو وجود کیونکہ ذاتِ حق کا ظہور ہے تو ذاتِ حق کا پورا نظام ظہور اس حرکت وجود میں بھی پایا جاتا ہے۔ تو اس کی ہر لحظہ، ہر لمحہ ایک نئی شان یعنی ایک نیا اظہار اور ایک نیا فعل ہے، ایک نیا کام ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اب انھوں نے یہاں کیونکہ وجود کو زندگی میں مدغم کرنے کے بعد وجود کی تصور میں بنی ہوئی ہیئت کو توڑا ہے۔یعنی وجود کو زندگی سے ہم معنی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وجود کو فلسفیانہ ذہن کی گرفت سے نکالا ہے۔جس کے لیے وجود ایک ایسا تصور ہے جس کی روشنی میں وہ زندگی، اس کے قوانین اور مظاہر کی توضیح کرتا ہے، ان کا فہم حاصل کرتا ہے۔اقبال نے کہا،نہیں۔تو اس کے بعد یہ اسی فلسفیانہ اور معقولی ذہن کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تو یہ سمجھتا ہے کہ زندگی کوئی ایسا راز ہے جسے عقل سے پایا جائے، زندگی کوئی ایسا بھید ہے جس کو کھولنے کے لیے ذہن کی ضرورت ہے۔ یہ سخت نادانی کا تصور ہے۔زندگی صرف ذوقِ پرواز کا نام ہے یعنی عروج کی طرف بڑھتی جانے والی حرکت ہی زندگی ہے۔ ذہن میں تصور سازی کے مراحل طے کر کے بننے والا کوئی نظریہ نہیں ہے۔یعنی زندگی ذہن کی ملکیت نہیں ہے۔زندگی وجود کا مشمول و مافیہ ہے۔اب اس میں راز کو ہم نے سمجھ لیا کہ راز وہ ہے جسے عقل راز کہے۔اب ذوقِ پرواز کو دیکھیے۔ ''فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی'' کہ ہم اپنی جس اصل سے پھوٹے ہیں اسی اصل کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ ایک یہ مطلب ہوا، دوسرا مطلب یہ ہوا کہ زندگی مادے کی پستیوں سے بلند ہو کر ذات کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کا نام ہے یعنی زندگی مادی ظہور سے ایک کامل شخصیت تک پہنچنے کا عمل ہے۔تیسرا مطلب یہ ہوا کہ زندگی دنیا سے خدا تک پہنچنے اور پہنچانے والی حرکت ہے۔ زندگی ارضیت سے اُٹھ کر سماویت تک مار کرنے کی اُمنگ ہے اور چوتھا مطلب ہے کہ زندگی خود سے بلند ہونے، اس سطحِ وجود سے اوپر اُٹھنے کی جہد مسلسل ہے۔یعنی اپنے آپ کی تکمیل کے لیے اپنے آپ سے اوپر اُٹھتے چلے جانا۔ یہ ہے ''ذوقِ پرواز''۔ ہر لمحہ اپنے نفیس وجود کو چھوڑ کر اپنے نفس مطلوب میں داخل ہونے کی کاوش کرو۔ یہ زندگی ہے۔ جو کچھ تم ہو اس سے بلند ہو کر جو تمھیں ہونا چاہیے ویسا بننے کی کوشش۔ یہ زندگی ہے۔تو اس شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کوئی ذہنی چیز نہیں ہے بلکہ وجودی قوت ہے۔

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

پست و بلند کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تاریخ کے عروج و زوال بہت دیکھ رکھے ہیں۔ نہ تاریخ کا کوئی عروج اسے کہیں ٹھہرنے پر راضی کر سکا، نہ تاریخ کا کوئی زوال اسے آگے بڑھنے سے روک سکا۔ کیونکہ اس کی خلقت حرکت ہے اور اس کو کہیں پہنچنے سے بڑھ کر یہ پسند ہے کہ وہ چلتی رہے۔ یہ سادہ مصرع نہیں ہے۔'سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جس راستے پر حرکت کر رہی ہے اس راستے کا کوئی اختتام نہیں ہے اور اس راستے میں اُٹھنے والا ہر قدم منزل پر پڑتا ہے یعنی یہ راستہ قدموں کے تسلسل سے طے نہیں ہوتا۔ یہ راستہ منزلوں کے تسلسل کا نام ہے۔تو اب سفر کی تعریف کر رہے ہیں کہ کون سا سفر پسند ہے۔سفر کی اہمیت کیا ہے:

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

جیسے حرفِ آخر کہا جاتا ہے اس طرح کہا ہے کہ زندگی کا سارا ساز و سامان ہی حرکت اور سفر کا نام ہے۔ زندگی کو اپنی بقا کے لیے جو سامان چاہیے وہ پورا سامان مسافرت کا سامان ہے، اقامت کے اسباب نہیں ہیں، تو سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز۔ تو حقیقت وہ ہے جس کی تصدیق زندگی سے ہو۔ تو زندگی کیونکہ سفر مزاج ہے لہٰذا سفر ہی حقیقت ہے اور قیام، اقامت کہیں ٹھہرنا کہیں رہ جانا یہ مجاز ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دیکھنے میں نظر آرہا ہے، حقیقت میں ہے نہیں۔ جیسے موت ہے، موت دکھائی تو دے رہی ہے لیکن موت کے کوئی تخلیقی معانی نہیں ہیں۔ تو اسی طرح ''سفر ہے حقیقت''۔ اس میں کہتا تو یہی ہے کہ سفر ہی حقیقی ہے، قیام ایسے ہی ہے۔ مجاز اور فریب نظر کو ملا لیں لیکن اس میں ذرا سا اپنی روایت میں رہ کے دیکھیں۔ تو حقیقت اور مجاز کا کیا تعلق ہے، حقیقت اور مجاز کہیں ایکدوسرے کے مقابل آتے ہیں۔ یعنی حقیقت تو واضح ہے، مجاز دھوکہ ہے لیکن دوسرے پہلو سے مجاز اس صورت کو کہتے ہیں جو حقیقت کا انعکاسِ واقعی ہو۔

مجاز اس صورت کو کہتے ہیں جو حقیقت سے منقطع بھی نہ ہو اور حقیقت کا پورا احاطہ کیے ہوئے بھی نہ ہو، یعنی مجاز اس صورت کو کہتے ہیں جو حقیقت کو بھی منعکس کرے اور اپنے آپ کو بھی مجھ تک پہنچائے۔

حضر کا مطلب ٹھہرنا، رہنا، قیام۔ تو کہتے ہیں کہ یہ جو تمھیں کہیں مکانات بنے ہوئے نظر آرہے ہیں کہیں پڑاؤ کے خیمے نظر آرہے ہیں تو یہ پڑاؤ والے خیمے اس لیے نہیں ہیں کہ تمھیں زندگی یہ چھوٹ دے رہی ہے یا یہ اجازت دے رہی ہے کہ تم جا کے ان خیموں میں رہو۔ یہ خیمے اس لیے لگائے ہیں تاکہ تم سفر کی طرف آمادہ رہو۔ اس دنیا میں ٹھہرانے کی جتنی گنجائش ہے وہ محض اس لیے ہے کہ تمھیں چلنے کا شوق حاصل ہوتا رہے۔

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

کیونکہ مسلسل حرکت کا نظام ہے تو یہ الجھ کے اس حرکت سے سلجھ بھی جاتی ہے اور سلجھنے میں یکسانی پیدا ہو جائے تو دوبارہ الجھن تخلیق کرتی ہے۔ یعنی زندگی کا ایک پاؤں الجھن ہے دوسرا پاؤں اس الجھن کو سلجھاتا ہے۔ تو زندگی کے تمام قدم ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے قدم ہیں۔ تو کہہ رہے ہیں کہ یہی جو اس کا جدلیاتی طرزِ عمل ہے یہ اس کی حرکت سے پیدا ہوا ہے اور اس کے اندر تصادم کی فضا ہی میں اس کی راحت ہے۔ زندگی کے لیے راحت کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے، یعنی ہر وقت تڑپنا

پھڑکنا اس کے لیے باعث آرام ہے۔ انھوں نے راحت، یہ بہت مشاقی سے استعمال کیا۔ راحت کہتے ہیں اس کیفیت کو جس میں مزید کی تمنا نہ رہے۔ شانت ہو جانا۔ یہ ہے راحت۔ تو کہہ رہے ہیں اس کی راحت ہی تڑپتے پھڑکنے میں ہے یعنی اس کو تڑپنے پھڑکنے کے علاوہ کوئی کیفیت منظور نہیں ہے۔

ہوا جب اُسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اس میں سمجھنے کی کوئی بڑی بات نہیں۔ اس منظر کو ذہن میں بنائیں کہ زندگی تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُٹھا رہی ہے۔ تمام کائنات کا ذرہ ذرہ تڑپا رہی ہے اور اچانک اس کا سامنا موت سے ہو گیا۔ یہ کیسا ڈرامائی منظر ہے، آپ اس کردار کو کہ جس سے ذرہ ذرہ بھرا ہوا ہے اس حقیقت کو اچانک موت کا سامنا ہو گیا تو چونکہ یہ موت سے اپنے مزاج میں مانوس نہیں ہے، موت سکون کا نام ہے۔ تو موت کے وقوعِ خارجی سے اس میں ایک حیرت اور ایک بے بسی سی طاری ہوئی یعنی یہ لگا کہ اب میں اس سے کس طرح نمٹوں یہ شعر بہت خوبصورت ہے لیکن فہم کے طور پر نہیں منظر کے طور پر۔ آپ پوری کائنات کا ایک سٹیج بنائیں اور اس میں اچانک کسی اندھیرے سے موت ایک کالا فرغل پہن کر آ گئی:

اُتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کے گھات میں

یہ دو شعر پڑھیں گے تو بات مکمل ہو گی۔ زندگی کو اپنے مرتبۂ اصل میں موت کا سامنا ہوا ہے یعنی زندگی اور موت عالم حقائق میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے یعنی موت بھی ایک اُصول ہے، زندگی دوسرا اُصول ہے۔ تو اپنی اقلیم میں ان دو اُصولوں میں جب سامنا ہوا تو اس وقت زندگی نے جانا کہ موت کو ڈھیر کرنا بہت مشکل کام ہے، موت پہ قابو پانا ابھی میرے بس میں نہیں ہے۔ کیونکہ زندگی کو عادت پڑی ہوئی تھی موجودات پہ اثر ڈالنے کی لیکن جب معدومات کا امام اس کے سامنے آ گیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا میں اس کو کیسے پکڑوں۔ تو جب زندگی اور موت کو دو واسطوں کے ذریعے دور دور کر کے کائنات میں اُتارا گیا، دنیائے عمل میں اُتارا گیا یعنی اِس جہان میں، تو زندگی نے موت کے ساتھ اپنی اُس دشمنی کو یہاں برقرار رکھا اور یہاں بھی اس نے اپنا مقصد بنا لیا کہ میں کسی بھی طرح موت پر فتح پاؤں گی، میں موت کو فنا کروں گی۔ مکافات کہتے ہیں بدلے کی دنیا۔ مکافات بدلہ یعنی عمل کی دنیا جہاں ہر عمل کا بدلہ ہے:

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

اقبال ہم آہنگ الفاظ کی تکرار کر کے ان سے معانی میں شدت پیدا کرنے کے بادشاہ ہیں۔ اظہار میں حسن پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ تو کہہ رہے ہیں کہ زندگی جہانِ مکافات میں کثرت کے ذوق کی وجہ سے جوڑا جوڑا بن گئی۔ اور دشت و کہسار سے لشکر بن بن کے اُٹھنے لگی۔ کس لیے۔ زندگی موت کے گھاٹ میں اُتر رہی ہے صف بندی ہو رہی ہے۔ لیکن اس میں اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج تو واضح ہے کہ موت کو مسخر کرنے کے لیے یہ ہو رہا ہے۔ 'مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج'۔ جوڑا جوڑا، دو دو جیسے اللہ نے فرمایا کہ جوڑا جوڑا پیدا کیا تمھیں۔ مذاقِ دوئی یعنی دوئی کے ذوق کی وجہ سے جوڑا جوڑا بنی۔ کیونکہ عالمِ کثرت میں آئی۔ تو یہاں اس کا ذوق دو ہونے کا ہو گیا ہے۔ ہے واحد لیکن عالمِ کثرت سے ہم آہنگ ہونے کے لیے یا عالمِ کثرت کی بنیاد بننے کے لیے اس میں دوئی کا جذبہ ہونا ضروری تھا۔ تو یہاں اُتر کے اس میں دوئی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس دوئی کے جذبے سے اس میں ساری کائنات کو جوڑوں جوڑوں میں بنا دیا۔ ہر چیز کا ایک جوڑا رکھ دیا گیا۔ حیات شروع ہو گئی۔ 'اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج' اس کی بھی ذرا تصویر دیکھیے کہ پہلا آدم، پہلی حوا اُتری اور اس کے بعد آدمی ہیں وہ گویا کائنات پہ ایک فاتحانہ یلغار کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں:

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اب اس سے بڑھ کے کیا تشبیہ آپ دیں گے۔ زندگی اساسِ دین ہے اساسِ کائنات ہے اور اس کائنات کی فنا ہو یا زندگی ہو یعنی موت اور زندگی کے تمام نتائج زندگی ہی کے اُصول پہ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی بھی تصویر بنائیں کہ زندگی کی ایک شاخ ہے اور کائنات زندگی کی اُس شاخ پہ لگے ہوئے پھول پتے ہیں، گرتے بھی جا رہے ہیں، نکلتے بھی جا رہے ہیں۔

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

جو اس شاخ سے گل ٹوٹتے دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ زندگی بے ثبات ہے، اس کو دوام نہیں ہے، عارضی ہے اور جو اس شاخ سے ٹوٹنے اور پھوٹنے دونوں کو دیکھتا ہے وہ کہتا ہے، اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات، کہ اے ناداں تو نے شاخ سے پتہ گرتے تو دیکھ لیا اُسی جگہ پر پتہ اُٹھتے نہیں دیکھا:

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

اس کا شکوہ دیکھیے کہ زندگی بہت تیز رفتار اور پلک جھپکنے میں جہاں پہنچنا ہو وہاں پہنچ جاتی ہے۔ زود رس جلدی پہنچنے والا۔ تیز جولاں جس کی رفتار تیز ہو۔ تو زندگی کی رفتار کتنی تیز ہے کہ اسے منزل تک پہنچنے میں وقت کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ 'تیز جولانی' میں کہہ رہے ہیں کہ زندگی مکان سے بلند ہے۔ جولانی خاص چیز ہے، ''جولاں'' میدان میں دوڑنا کو کہتے ہیں اور زود رس یہ زمانیت کو توڑنا ہے۔ اس نے تیز جولانی میں مکانیت کو توڑ دیا، زود رسی میں زمانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یعنی زندگی time and space سے بننے والے order سے زیادہ تیز اور ماورا ہے اور اس پہ بتا رہے ہیں کہ یہ ماورائیت کس طرح کی ہے جو end of existance جو end of universe جو ends of creation، time اور space سے ماورا ہیں۔ time اور space انھیں اپنے اندر سمو نہیں سکتے۔ یہ ان دو ends کو ایک ہی سانس میں طے کرتی ہے۔ یعنی ازل سے ابد تک ایک سانس میں پہنچتی ہے۔ ازل سے ابد کا مطلب خدا کا وہ زمانہ ہے جو کائنات کے زمانے سے ماورا ہے۔ ازل زمانے سے پہلے، ابد زمانے کے بعد۔ کہتے ہیں کہ یہ time order اس کا کیا کر سکتا ہے۔ اس کی رفتار وقت کے کسی پیمانے سے ناپی نہیں جا سکتی۔ اس کا راستہ مکان کے کسی بھی پھیلاؤ میں سمیٹا نہیں جا سکتا۔

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام

زمانے کو جوڑیں، اس میں ہر دن ایک حلقے کی طرح ہے۔ ان حلقوں کے جڑ جانے سے جو زنجیر بنتی ہے وہ زنجیر زمانہ ہے۔ یہاں زنجیر ایام سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ ایام کو زمانے نے جکڑا ہوا ہے۔ اور یہ دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ دموں کا لفظ پہلے شعر کے نفس سے ملا کے کہا ہے کہ زندگی جس نفس، جس سانس سے ازل سے ابد تک پرواز کرتی ہے، ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کرتی ہے وہی سانس اُس کے مظاہر کو بھی عطا ہوا ہے زندہ رہنے کے لیے۔ تو سانس کے الٹ پھیر آنے جانے کا نام زمانہ ہے۔ دم دینا یعنی دھوکہ دینا یہ الٹ پھیر ہے اور اُلٹ زنجیر کی رعایت سے بھی دیکھیں، کہ دونوں کی بھی خاصیت الٹ پھیر ہے اور زنجیر میں ہر حلقہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ تو ایک حلقے سے نکلے تو وہ گویا الٹ کے دوسرا حلقہ بن گیا۔ دوسرے حلقے میں پھیر پیدا ہوا تو تیسرا۔ اور الٹ میں یہ ہے کہ دن رات بنتا ہے یہ الٹ ہے اور دن اگلے دن کا ذریعہ بنتا ہے یہ پھیر ہے۔ اس کے کئی انداز ہیں، اور اس میں سمجھنے والی بات یہ ہے کہ زندگی ایک نفس ہے اس نفس کا ظہور ہماری آپ کی سانسیں ہیں جو زندگی کی سب سے بڑی دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرا اس میں جو سمجھنے کی چیز ہے جس کی داد دی جانی چاہیے کہ یہاں زمانے کی بہت مکمل طریقے سے تعریف متعین کر دی ہے۔ زمانہ یعنی زمان کائناتی، زمانِ سلسلہ وار، یہ دنوں سے بننے والی زنجیر ہے، یہ

روز وشب کا مجموعہ ہے۔ دوسری تعریف یہ ہے کہ یہ ہماری سانسوں کا آنا جانا ہے۔ علمی زبان میں کہیے تو یوں کہ ان دو مصرعوں میں انھوں نے پہلے مصرعے میں معروضی حیثیت بھی دے دی اور دوسرے مصرعے میں اُسے موضوعی بھی بنا دیا۔ یعنی زمانہ آفاقی وقت کے طور پر بھی بتا دیا اور اسی زمانے کو انفسی وقت بھی بنا کے دکھا دیا یعنی ''دموں کا الٹ پھیر'' زمانہ ہے۔ یہ زمانہ کیا ہوا، انفس کا زمانہ اور زنجیر ایام کیا ہے آفاق کا زمانہ۔

اس بند کو اور فلسفیانہ تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو اس کے معانی زیادہ کھل سکتے ہیں یعنی self and time کے طور پر، زمانہ اور نفس انسانی کے تناظر میں۔ وجودیت Existentialism میں یہ مسئلہ بہت شدت کے ساتھ اُٹھا کہ انسانی ذات اور زمانے یا زمان اور وجود کی کیا نسبت ہے اور اس میں ہائیڈیگر کا ایک معرکہ آرا کام بھی ہے۔ اس کی جو بنیادی کتاب ہے اس کا نام بھی *Being and Time* ہے۔ اس کو اگر اُس پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو وجودیت والوں نے اور ان کے اطراف کے مکاتب فکر میں جدید فلسفے کے اندر وجود یا تصورِ ہستی دو سطحوں سے اوپر نہیں اُٹھ سکا۔ انیسویں صدی کے آخر سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک کا جو Existentialism ہے جو یوں سمجھنا چاہیے کہ پچھلی صدی کا ایک رسمی فلسفہ اور ایک سب سے بڑے نظریۂ فن کے طور پر تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جدید انسان کی ذہنیت اور جدید انسان کی طبیعت کا اتنا بڑا نمائندہ فلسفہ اُس وقت تک کوئی نہیں تھا۔ تو ایک ایسا رائج الوقت فلسفہ جس نے فلسفیانہ تصورات، نظریات بھی دیے اور ادبی نظریات بھی پیدا کیے، جس نے فلسفہ اور ادب ساتھ ساتھ پیدا کیا اور اسی وجہ سے Existentialism کو سمجھنے کے لیے اس کے اُس نظریے کے تحت لکھا جانے والا ادب پڑھنا بہت ضروری ہے۔ تو اس پس منظر میں اگر آپ دیکھیں تو ہمارے یہاں اقبال ایک آدمی تھا جو ایک پہلو سے ان کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا وہ پہلو یہ کہ وہ فلسفی بھی تھا، شاعر بھی تھا اور اس کا فلسفہ اور شعر دونوں مل کر ہی اس کی فکر تک پہنچاتے ہیں جیسے سارتر تھا وہاں کہ وہ تو بہترین افسانوی ادب کا خالق بھی تھا، ناول بہت کمال کے لکھے۔ ڈرامے، افسانے بہت کمال کے لکھے اور ساتھ میں ایک اپنا نظریہ بھی رکھتا تھا۔ تو اسی سے کچھ پہلے ہمارے یہاں اُس کا ایک نمونہ اقبال پیدا ہو چکا تھا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی روحِ عصر تھی جو اپنے مظاہر تلاش کر رہی تھی، وہ روحِ عصر یہ تھی کہ میرے نفسیاتی وجود اور میرے عقلی وجود میں کوئی زندہ ربط دریافت ہو جائے یعنی میرے تصورات اور میرے احساسات کے درمیان کلاسیکی عقلیت پرستی نے جو فاصلہ پیدا کر دیا تھا وہ ختم ہو جائے۔ پچھلی صدی کے غالب حصے میں محسوس کیا جانے والا فلسفہ لکھا گیا ہے اور تصور بن سکنے والے احساسات بیان کیے گئے ہیں۔

Existentialism میں وجود سے مراد ہے انسانی وجود۔ Being as such وجود فی نفسہٖ ان کا مقصود نہیں ہے اور زمان سے مراد یہی زمانِ کائناتی یہی ہمارا دنیاوی وقت لیتا ہے یعنی زمانِ تاریخی اور نفس

انسانی میں کیا ربط ہے، یہ ان کا موضوع ہے۔ اس میں انھوں نے نوعِ انسان کو یا تو حیاتیاتی، حیوانی سطح پر رکھا یا نفسیاتی درجے پہ رکھا۔ یعنی ان کے یہاں انسان فقط ایک طبیعی چیز ہے اور ایک نفسیاتی وجود ہے۔ یہ ذہن میں رہنا چاہیے۔ عین انھی کے بیچ میں کھڑا ہوا ہندوستان میں ایک آدمی اسی سوال پر، اسی ڈھب سے غور کرتے ہوئے یہ بتا رہا ہے کہ انسان محض طبیعی وجود نہیں ہے، فقط نفسیاتی وجود نہیں ہے حتیٰ کہ صرف ذہنی وجود بھی نہیں ہے بلکہ اس عمارت کی ایک چوتھی منزل ہے جس سے یہ عمارت کی بقیہ تینوں منزلیں اپنی شناخت حاصل کریں اور وہ منزل ہے کہ انسان دراصل ایک روحانی وجود ہے تو یہ جوہر ملکوتی، یہ اساس روحانی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کی تعریف ماورا الطبیعی سطح پر متعین کی جائے نہ کہ محض جسمانی، حیاتیاتی سطح پر، نہ نرے نفسیاتی اور ذہنی اعتبار سے۔ تو یہ ایک واحد تصور انسان تھا جو وجودیوں کے ذہنی غلبے کے زمانے میں پوری طرح بیان ہوا اور جس نے انھیں ساری دنیا کو فتح کر دینے سے روک دیا۔ انسان کا جوہر لاہوتی، مابعد الطبیعی اساس اس کی خودی ہے۔ وہ خودی جو اس کے طبیعی وجود کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے لیکن اس کے عنوان کو قبول نہیں کرتی۔ جو ذہنی اور نفسیاتی وجود کو بھی اپنے احاطے اور اپنی شرائط پر لیے ہوئے ہے لیکن ان سے مستغنی اور ماورا ہے۔ اس روحانی تعریف کے مطابق انسان میں یہ جوہر فعالی اور عملی حالت میں موجود ہے اور صرف اس بات کا منتظر ہے کہ اس کو شناخت کیا جائے، اس کا تحقق کیا جائے۔ تو اب علامہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے جوہر روحانی کے ساتھ زمانِ تاریخی میں گھرا ہوا، وقت کی بیساکھیوں پر کھڑا ہوا، وجود نہیں ہے بلکہ انسان کی روحانی اصل اس میں ایسی وسعت اور ایسی گہرائی پیدا کرتی ہے کہ یہ زمانِ تاریخی اس کے اسالیبِ ہستی میں سے صرف ایک اسلوب ہے۔ انسان اس دائرے میں گھرا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ دائرہ اس کے مختلف دائروں میں سے ایک ہے۔ اس بند میں یہ بتایا ہے اقبال نے، اور اقبال کا سب سے بڑا فلسفیانہ اور سب سے بڑا شعری مسئلہ ہی یہ ہے کہ انسان کے روحانی وجود اور زمانِ تاریخی میں وہ ربط پیدا کیا ہے جو تصور کی حیثیت سے بھی مکمل ہو سکے اور عملی نتائج بھی پیدا کر سکے۔

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

یہ زمانِ مسلسل جو ہے، یہ روز و شب سے ترکیب پانے والا متحرک زمانہ، یہ میری سانسوں کے آنے جانے کا نام ہے یعنی دن اور رات میری سانس کے آنے جانے کے مظاہر ہیں، اس کے اصل و اساس کی حیثیت نہیں رکھتے۔ 'دموں کے الٹ پھیر'' کو ذرا غور سے سمجھنا چاہیے۔ زمانہ میرے انفس میں یعنی میرے اندر اپنی بنیاد رکھتا ہے اور میرے باہر اس بنیاد پر ایک زمانی سانچہ بن کر دکھاتا ہے۔ یہ بات اُس دور کے پورے فکری ماحول میں نہیں کہی جا رہی تھی، اس پورے فکری تناظر میں انسان کو زمانے کی زنجیر سے بندھا

ہوا قیدی بنانے پر زور تھا اور بس۔ اس کی قید کی مختلف تعبیریں کی جارہی تھیں۔

اس کی جو قابل شرح باتیں تھیں جو ہم کر سکتے تھے وہ تو ہوگئیں۔ اس میں ایک خوبصورتی کو اور ذرا محسوس کرلیں اور اس شعر میں جو اگلے بند کے اندر سما جانے والا ایک مادہ پوشیدہ ہے اس کی طرف میں اشارہ کردوں۔ کیونکہ اقبال کے یہاں اکثر بڑی نظموں کی ترتیب کا عمل تھوڑا سا پوشیدہ ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں معانی کی حرکت واقعاتی اور تاریخی یا عمومی منطق کے مطابق نہیں ہوتی۔ وہ بڑی حد تک اشاراتی ہوتی ہے تو جو اس اشاراتی حرکت کو نہ سمجھ پایا وہ نظم کے ایک بڑے مضمون اور خیال سے محروم رہ جاتا ہے۔ خوبصورتی اس میں یہ ہے کہ اگر آپ زنجیر کا تصور کریں تو یہ الٹ پھیر کی تصویر ہے۔ یعنی زنجیروں کی کڑیوں کو اگر آپ سامنے رکھیں اور پھر کہیں کہ یہ تو اُلٹ پھیر ہے تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تو الٹ پھیر کی ایسی تشبیہ یا زنجیر کے تسلسل اور حلقوں کو الٹ پھیر کہنا یہ بہت حسن پیدا کرنے والی بات ہے۔ دوسرا اس شعر میں انھوں نے یہ کام کیا ہے کہ نفس (انسانی سانس) اور زمانے کو آپس میں جوڑ دیا۔ اس جوڑ سے یہ اگلا بند شروع کریں گے۔ بس یہ ذہن میں رہے کہ زمانہ جس طرح کائنات میں سانس کی حیثیت رکھتا ہے بالکل اسی طرح جیسے میرے اندر سانس کا ایک نظام ہے تو میرا نظامِ تنفس ایک ہی ہے۔ وہی نظامِ تنفس ہے جو زمانے کے نام سے کائنات میں جاری ہے۔ اب آپ دیکھیں کتنی خوبصورت بات ہے۔ کہ وقت کو کائنات کا نظامِ تنفس کہا ہے۔ تو اب یہ جو یہاں کہہ رہے ہیں کہ یہ ''موجِ نفس کیا ہے، تلوار ہے''۔ اب یہ موجِ نفس لازماً انسانی نہیں ہے۔ انھوں نے کہہ دیا زمانہ موجِ نفس ہے جو انسان میں بھی جاری ہے اور کائنات میں بھی جاری ہے۔ انسان میں سانس کے عنوان سے جاری ہے کائنات میں زمانے کے نام سے جاری ہے۔ اب کیا ہوا کہ موجِ نفس سے آگے بڑھ کے اس کو دوسری تشبیہ بھی دے رہے ہیں کہ یہ تلوار ہے۔ پچھلے بند میں انھوں نے آپ کو اس قابل بنا دیا کہ آپ زمانے کو موجِ نفس کہنا قبول کرلیں، اس کی داد دے سکیں۔ اب اگلا قدم اُٹھا رہے ہیں اسی کو میں کہہ رہا ہوں یہ اشاراتی حرکت اور ربط ہوتا ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ زمانہ جو موجِ نفس ہے اس کی definition پوری نہیں ہوئی یہ اپنی بناوٹ میں موجِ نفس ہے، اپنی فعلیت میں تلوار ہے۔ اب آپ ذرا غور کیجیے، آپ موجِ نفس کا جو بھی تصور کریں گے وہ تلوار کی شکل ہوگا۔ آپ ذرا موجِ نفس کو چشمِ تصور میں قائم کرنے کی کوشش کیجیے وہ تلوار جیسی بنے گی۔ تو کہہ رہے ہیں کہ یہ زمانہ اپنی بناوٹ میں موجِ نفس ہے، اپنی فعلیت میں اور تاثیر میں تلوار ہے۔ یہ چیزوں کو کاٹتا ہے جوڑتا نہیں۔ ابھی آپ دیکھیے کہ زمانہ تلوار ہے یہاں تک ہم پہنچے۔ زمانہ کیوں تلوار ہے کیونکہ یہ چیزوں کو پرانا کرتا ہے، چیزوں کو ایک دوسرے سے منقطع کرتا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ اگر زمانہ بیچ میں سے نکال دیا جائے یعنی ہمارے نظامِ اشیا میں سے وقت نکال دیا جائے اور ہمارے شعور میں سے وقت نکال دیا جائے تو

چیزیں ایک دوسرے سے مختلف نہیں رہیں گی، چیزیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو پائیں گی۔ زمانہ چیزوں کو الگ کرتا ہے تو الگ یہ حیاتیاتی معنی میں موت سے اور فرسودگی سے کرتا ہے اور اخلاقی اور روحانی اور وجودی معنی میں انفرادیتوں کی تشکیل سے کرتا ہے، امتیاز سے کرتا ہے۔ تو کہہ رہے ہیں یہ موجِ نفس تلوار ہے یعنی زمانہ تلوار ہے۔ اب نفسِ انسانی اور زمانے کا ربط بتا رہے ہیں۔ زمانے کو تلوار کہہ کر اس کو آخری درجے پہ متعین کر دیا۔ زمان کے سامنے میرا ہونا یہ کیا معنی رکھتا ہے۔ اس زمانے میں خودی کا کیا وجود ہے؟ کیا معنویت ہے؟ وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ زمانہ تلوار تو ہے لیکن یہ تلوار کام نہیں کر سکتی اگر خودی اس پہ مقدم نہ ہو یعنی اس تلوار کو دھار خودی دیتی ہے۔ یعنی اس تلوار کے مقصد کو پورا کرنے کی صلاحیت اس میں خودی سے ودیعت ہوئی ہے۔ خودی یعنی زمانے کو اپنے مقصد میں کامیابی کی وجہ خودی فراہم کرتی ہے یعنی وہ انفرادیتِ محض پہلے ہے جسے زمانہ مختلف انفرادیتوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ آپ سمجھے کہ اقبال کیا کہتے ہیں کہ انفرادیت محض یعنی خودیِ مطلق واحد ہے اور خودیِ مقید کثیر ہے۔ وہ خودیِ مطلق کا کثیر ہو کر بھی خودی کے عنوان کا مستحق رہنا، یہ زمانے کی وجہ سے ہے اور زمانہ اس کا سبب اس لیے ہے کہ خودی زمانے سے پہلے کی ہے۔ قدرے زیادہ ٹھیٹھ فلسفیانہ بیان ہو گیا۔ ہم اس کو شاعری سے قریب رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ وجود اور زمان فلسفے کا بہت ہی بڑا موضوع ہے جو سقراط سے چلتا ہوا آج تک چلا آ رہا ہے۔

علامہ اس مبحث میں یہ کہہ رہے ہیں کہ زمان کی پوری کارکردگی وجود کی بنیاد پر ہے یعنی زمانہ وجود پر حاکم نہیں ہے۔ زمانہ تو ہل ہی نہیں سکتا تھا اپنی جگہ سے اگر دو خودیوں کے درمیان پل اور ربط بننے کی ضرورت نہ پیش آئی ہوتی۔ کیونکہ دو خودیوں کے درمیان رابطے، تعلق اور نسبت کی ایک ضرورت تھی لہٰذا اس ضرورت کو تکمیل کے لیے زمانے کو ایک ماتحت قوت کے طور پر پیدا کیا گیا۔ خودی وہ انفرادیت ہے جو زمانی نہیں ہے، جو زمانے کی دین نہیں ہے اس کے بعد دوسرے مضمون کی جانب منتقل ہوئے۔ پہلے دو مصرعے میں زمانے اور اس سے خودی کے مبحث کی طرف اشارتاً منتقل ہوئے۔ اب اگلے شعر میں خودی پہ گفتگو کر رہے ہیں۔ یعنی یہ بتا کے میں نے زمانہ بتا دیا ہے۔ اب میں خودی کے سلسلہ میں اتنا بڑا دعویٰ کر چکا ہوں تو میں اس پہ بات کرتا ہوں کہ خودی کیا ہے ''رازِ درونِ حیات''۔ ''خودی کیا ہے بیداریِ کائنات''۔ پہلے عرض کیا گیا تھا کہ زمانے کو نظامِ تنفس بنا کے انھوں نے آفاقی اور انفسی دونوں کی گنجایشیں پیدا کر دیں۔ اب خودی کو اس کے بڑی سطح وجود پر جا کر اس کے ظہور و بطور کو بیان کرتے ہیں۔ یہ ذرا مشکل ہے۔ بتا دیا زمانہ کیا ہے۔ اب بتا رہے ہیں کہ خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات کہ زندگی کی جو کل پونجی ہے، زندگی کی جو اصل حقیقت ہے وہ خودی ہے اور خودی کیا ہے بیداریِ کائنات زندگی کا باطن بھی خودی ہے زندگی کا ظاہر بھی خودی ہے۔ انفس بھی زندگی کے لیے خودی ہے، آفاق بھی خودی ہے۔ خودی زندگی کو بامعنی بناتی ہے اور

زندگی کے پورے سانچے کو زندہ رکھتی ہے، زندگی کو بامعنی بناتا ہے ''رازِ درونِ حیات'' کی حیثیت سے اور زندگی کے پورے سانچے کو بامعنی اور زندہ بناتا ہے ''بیداریِ کائنات'' کی شکل میں۔ یعنی خودی ہی ہے جو انفس کی حقیقت اور آفاق کی اصل طاقت ہے۔ حیات و کائنات تو واضح ہے۔ حیات کیا ہے حیات 'ہونے' کا اندرونی اُصول ہے اور 'ہونے' کا بیرونی اُصول کائنات ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ 'ہونے' کی ان دونوں سطحوں کے پائے خودی کی زمین میں گڑے ہوئے ہیں۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

اب دموں سے موجِ نفس میں آ گئے۔ یہ اس خیال کا تسلسل ہے کہ جس چیز کو میں دم کہہ رہا ہوں یہ موجِ نفس ہے اور یہ موجِ نفس تلوار ہے۔ یعنی میرا نفس محض ایک حیاتیاتی عمل نہیں ہے بلکہ میرے تنفس کی قوت دراصل ایک فاتحانہ طاقت ہے۔ تلوار کا مطلب ہے فاتحانہ طاقت۔ میں سانس کسی قانونی مادے سے مشروط قانونی زندگی کسی حیاتیاتی طبعی پیمانے پر محدود حیات کے ضابطوں کی پابندی کر کے نہیں لے رہا ہوں بلکہ میرا سانس لینا حیات کا بانی ہے، میرا تنفس تاریخ کا موجد ہے۔ یہ ہے تلوار۔ تلوار سے کیا چیزیں ثابت ہوئیں۔ دو چیزیں ہیں بالکل سامنے ثابت ہوں گی۔ تیسری میں بعد میں عرض کرتا ہوں۔ ایک چیز ہے غلبہ، دوسری چیز ہے تصرف۔ یعنی طاقت اور تصرف۔ طاقت اور اقتدار۔ کہ میرا عمل زیست ہی زندگی کے کائناتی مظاہر کی کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے۔ میرا جینا کائنات کو جینا سکھاتا ہے۔ تو موجِ نفس یہ ہے۔ میرا اُصولِ حیات یہ ہے۔ تو یہ موجِ نفس تو تلوار ہے اور خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے۔ اس کو ذرا غور سے دیکھیے۔ پہلا مصرع انسان کا حیاتیاتی سیاق وسباق اور دوسرا ہے انسان کا وجود در و بست۔ یہ ان دونوں میں فرق ہے۔ حیات کی شکل میں ہم مشترک ہیں، وجود کی صورت میں ہم ایک دوسرے سے ممتاز اور منفرد ہیں۔ تو حیاتیاتی سطح پر بھی یعنی حیاتیاتی سطح پر بھی میرا عملِ حیات کائنات کے نظامِ حیات کی تراش خراش کرتا ہے۔ اس کے مرنے اور جینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ وہ تلوار ہے کہ جس کو چاہتی ہے مارتی ہے اور جس کو چاہتی ہے اس کی طرف سے گزر کے اُسے زندگی کا اذن دے دیتی ہے۔ یعنی تمام سطحِ حیات دراصل میرے تصرف میں ہے اور میرا جینا ہی اس پورے دائرۂ حیات کا وہ مرکز ہے جو ہٹ جائے تو معدومیت یقینی ہے، موت یقینی ہے۔ اب کہہ رہے ہیں کہ حیاتیاتی انسانی سطح کائنات کی زندگی میں مرکز کی حیثیت رکھتی ہے، ایک متصرف مرکز۔ اور خودی اب انسان کی ملکیت ہے۔ حیات کی سطح پر انسان کائنات سے مشترک ہے لیکن خودی کے درجے میں وہ کائنات سے ورا اور بالاتر ایک اُصول سے وابستہ ہے، کائنات سے ممتاز اور منفرد ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ میرا تو حیاتیاتی نظام بھی ایسا ہے کہ وہ غالب قوت کی حیثیت رکھتا

ہے۔ دوسری طرف میرے وجود کا جوہر ملکوتی، میری مابعد الطبیعی اساس میری حیات کی اس سطح کو قائم کرنے اور رکھنے کا واحد سبب ہے۔ یعنی میرا یہ حیاتیاتی مرتبہ دراصل میری خودی اور میرے مرتبہ ذات، میرے اُصول وجود کی کارفرمائی اور ظہور ہے۔ تو خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے یعنی میرے موج نفس، میری سطح حیات میں خودی نے ایک بلندی اور غلبہ اور رفعت پیدا کردی۔ تو کہہ رہے ہیں کہ یہ اصیل تلوار ہے کیونکہ اس کی اصل خودی ہے۔ خودی جو اپنے جوہر میں ماورا الطبیعی ہے اور اپنی فعلیت میں کونیاتی ہے۔ یہ آگے آرہا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ میری خودی اللہ کی خودی سے جلا پاتی ہے۔ میری خودی کی سند اللہ کی خودی ہے، میری حیات کی سند میری خودی ہے اور تلوار کہہ کر انھوں نے ایک استعمال کیا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے اَلْوَقتُ سَیْف یہ انھوں نے اسرار و رموز میں لکھا بھی ہے، تو اس طرف بھی ذہن جاتا ہے کہ وقت کو تلوار کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وقت کو انسانی تحویل میں دے کر تلوار کہا جائے۔ یعنی وقت تلوار ہے کا مطلب یہ ہے کہ وقت جو انسان گزارتا ہے وہ تلوار ہے۔ یعنی وہ وقت اگر انسان کے ہاتھ میں آئے تو تلوار ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات، حسن کلام دیکھیے کہ پہلے دو مصرعوں میں جو مضمون بنایا وہ متقابل مضمون ہیں ان کو جوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نیچے اسی ترتیب کی پابندی کی ہے۔ ابھی ہم نے کہا ناں موجِ نفس انفس کا عملِ حیات ہے۔ دوسرے مصرعے میں اس کو بالکل کھول رہے ہیں۔ یہی بات کہہ رہے ہیں کہ ''خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات'' کہ میری حیات میرے باطن کی ملکیت اس کا وصف ہونے سے زیادہ یہ حیات کے درونِ مابعد الطبیعی کی دین اس کی تاثیر ہے۔ تو وہ جو مابعد الطبیعی، کونیاتی درونِ حیات، اس کا باطن ہے اس کا وارث، اس کا حامل مَیں ہوں، تو اب کہہ رہے ہیں ''خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات'' کہ خودی حیات کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو لفظ کے لیے مشکل معانی رکھتے ہیں، سادہ معانی نہیں۔ ایک سادہ لفظ کے بھی مشکل معانی ہوتے ہیں۔ تو خودی اور زندگی کی یہ نسبت ہے کہ جیسے ایک سادہ لفظ میں نہایت دقیق اور مشکل اور ہمہ گیر معانی سمائے ہوئے ہیں، زندگی اپنے ظاہر میں سادہ ہے، اپنے باطن میں خودی ہے۔ زندگی اپنے ظاہر میں پیڑ پودے، خچر اور گھوڑے ہیں۔ یہ میں نے کیوں کہا ہے مشکل معانی، یہ ''رازِ دروں'' کی وجہ سے کہا ہے کہ راز میں پیچیدگی، گہرائی، ابہام ہوتا ہے تو یہ خودی زندگی کے پیچیدہ، نگھم، بنیادی، بڑے اور حتمی معنی کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ 'درون' وہ ہے جو پورا کا پورا ظہور نہ پائے۔ اظہار میں کلیتاً صرف نہ ہو۔ 'رازِ دروں' وہ ہے جس کی وجہ سے اس کا ظرف موجود ہے۔ اس کے ظرف کی ساری قیمت اُس مظروف، مافیہ کی بنیاد پر ہے لیکن وہ مشہود و مافیہ اس ظرف سے ظاہر نہ ہو۔ وہ اس ظرف کو پورا

ظاہر کر دے گا خود کے اس کے حوالے سے پورا ظاہر نہیں ہوگا۔ تو کہہ رہے ہیں کہ خودی اسی وجہ سے اپنے ظرف سے زیادہ ہوتی ہے۔ اپنے ظرف کا مرتبہ ہستی طے کرتی ہے اور اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی خودی قوامِ فطرتِ ہستی ہے اور 'رازِ درونِ حیات' کا ایک مطلب ہے کہ حیات جس کی وجہ سے بامعنی ہو۔ اگر یہ نہ ہو تو حیات مہمل ہے۔ اب یہ یہاں بھی ہائیڈیگر کا قول مجھے یاد آیا۔ ہائیڈیگر وجود کی دو قسمیں کرتا ہے Authentic being اور non-authentic being۔ تو اگر خودی کے ساتھ ہے تو وہ وجودِ اصیل ہے۔ یہ اقبال نے بھی کہا ہے۔ تو خودی کے بغیر ہے تو وہ وجودِ غیر اصیل ہے۔ کہتے ہیں کہ زندگی کی اصالت، زندگی کی معنویت، زندگی کی مقصدیت یہ سب خودی پر منحصر ہے۔ وہ خودی جو انسان میں اپنی تکمیل پاتی ہے اور چیزوں میں انسان کی خلاقیت سے سرایت کرتی ہے۔ خودی کیا ہے بیداریِ کائنات۔ ایک ایک لفظ بہت بامعنی ہے۔ رازِ درونِ حیات، زندگی کا باطن، بیداریِ کائنات، خودی کو زندگی کا ظاہر بیداری کیوں کہا ہے۔ کمال دیکھیں 'بیداری' اور 'راز' میں ایک تضاد کی بھی نسبت ہے۔ 'راز' میں اندھیرا ہے، اس میں ابہام ہے، اس میں دھندلکا ہے اور 'بیداری' میں روشنی ہے۔ بیداری، خودشعوری یا شعور ہے۔ جب آپ کائنات کو لائیں گے تو یہ اجتماعی چیز ہوگئی۔ 'بیداری' کا ترجمہ ہے شعورِ ذات یا خودشناسی۔ تو خودی کائنات کو اپنا تحقق کرے یا خودشناس ہونے کے قابل بنا دیتی ہے۔ میں اسی وقت موجود ہوں جب میرا موجود ہونا میرے شعور میں ہو۔ اگر موجود ہونا میرے شعور میں نہیں ہے ''مَیں'' کے عنوان سے تو اس کا مطلب ہے کہ میں موجود نہیں ہوں۔ تو انسان کا جو اصلی مایۂ ادراک ہے وہ شعورِ رانا یا شعورِ انیت ہے۔ انسان کا سارا علم اور سارے تجربات جس مرکز سے مس ہوکر، جس کے ربط سے اس کے لیے بامعنی بنتے ہیں وہ اس کا شعورِ انیت، احساسِ ذات یا ''مَیں'' ہونے کا ادراک ہے۔ یہ ہر احساس، ہر تجربے، ہر معانی کی بنیاد ہے۔

شعور و ادراک میں ''مَیں'' مرکز میں رہتا ہے اور مَیں مرکز میں نہ رہے تو شعور کا قوام ہی نہیں بن پائے گا۔ اس پہ اقبال نے خطبات میں اچھی بحث کی ہے۔ تو اَب یہ کہہ رہے ہیں کہ خودی نے حیات کو روح اور معانی بھی دیے اور کائنات میں اس کو ظاہر کر کے کائنات کی خودشناسی کا سامان بھی کیا۔ تو یہ ہے خودی۔

خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اب یہاں ایک شاعرانہ بات کی ہے، اوپر دو شعروں میں انتہائی فلسفیانہ بات کی، اس کے بعد وقفہ لینے کے لیے ایک شاعرانہ بات کر دی جس میں معنی کا اضافہ شاید اتنا نہ ہو لیکن اس معنی کو محسوس کرنے کا دروازہ کھولا ہے۔ معانی بہت ہیں لیکن یہ معنی آپ کو یہ شعر پڑھتے ہی اپنی معنویت کو جذب کرنے کی دعوت نہیں دے گا۔ یہ شعر آپ کو بلا رہا ہے کہ مجھے محسوس کرو اور میری بنیاد پہ تھوڑا اپنے اندر ایک ہیجان

بناؤ۔''خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند'' یہ پوری تعریف ہے خودی کی اگر فلسفہ اقبال میں دیکھیں گے اور پوچھیں کہ ایک آدھ جملے میں بتاؤ اقبال نے جہاں اپنا تصورِ خودی پورا بیان کر دیا تو میں یہ مصرع پیش کر دوں گا۔ اس مصرعے کو آپ اس طرح سمجھیں کہ پورا تصورِ خودی اس مصرعے میں کوئی ضروری جزو ضائع کیے بغیر سمٹ آیا ہے۔

بدمستی کہتے ہیں نشے میں چور ہو جانا، بالکل مدہوش ہو جانا۔ یہ بہت جوشیلا مصرع ہے۔ اتنا جوش اور اتنی معنویت، یہ ہمارے ہاں کہا ہے! اس شعر میں جوش ایسا ہے کہ آدمی نعرے لگانے لگے تو کوئی بعید نہیں ہے اور معانی اتنے ہیں کہ آدمی کو دس بڑے دماغ کرائے پر لینے پڑیں گے۔ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہوتی ہیں۔ یہ ہمیں سیکھنی چاہئیں۔

یہ بہت ہی مکمل مصرع ہے''خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند''۔ اقبال نے اس جہت سے خودی کا اتنا مکمل بیان اور کہیں نہیں کیا۔ یعنی خودی کی انفرادی سطح اور خودی کا اجتماعی پھیلاؤ۔ خودی کا انفسی اُصول اور خودی کا آفاقی کردار۔ خودی خدا کے حضور میں ہونا، خودی کا خدا کے غیاب میں رہنا۔ یہ جو ان کے بڑے پکے مضامین ہیں ان سب مضامین کا سب سے مکمل اظہار اس ایک مصرعے میں ہوا ہے'خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند'۔ خودی جلوہ بدمست یعنی جلوہِ دوست میں سرمست ہے۔ خودی دوست کے جلوے میں گم بھی ہے اور دوست کے جلوے میں گم ہونے کی حالت میں بھی دوست کے جلوے سے الگ ہی ہے۔

حضور کی انتہا کے ساتھ دوست کے حضور میں حاضر بھی ہے اور وجود کی پوری شدت کے ساتھ دوست کے غیاب میں موجود بھی ہے۔ آپ سمجھیے یہ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ اپنے مقصود کو دیکھنے کی آخری حد پہ جا کے دیکھ بھی رہی ہے اور غیاب کے انتہائی درجے تک پہنچ کے وہ اپنے مقصود سے غائب بھی ہے۔ یعنی خودی وہ ہے جو دوست کے حضور اور غیاب دونوں کا حق ادا کرتی ہے۔ دوسرا کہ محبوب کے حضور میں بھی خود کو برقرار رکھے۔ خلوت پسند کا مطلب ہے اپنے گرد حصار بنا لینے والا۔ تو خودی عین حالت حضور میں اپنے گرد حصار بنائے رکھتی ہے کہ کہیں جلوۂ محبوب میں خود کو فنا نہ کر لے۔ خودی وصل کے آخری ممکنہ مرتبے میں بھی اپنے تشخص، اپنی ہستی اور اپنے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ تو خودی کا موجود ہونا، مثال کے طور پر ایک ایسے پیڑ کی طرح ہے جسے صبح فراق کے پانی سے سینچا جاتا ہے اور شام کو آبِ وصال سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس کو دونوں طرح کے پانی چاہئیں۔ تو خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند یعنی خودی اپنے باہر بھی دیکھتی ہے اور اپنے اندر بھی موجود رہتی ہے۔ اس کا آسان مطلب اگر یہ ہے کہ خودی دیکھنے کا حق بھی ادا کرتی ہے اور خودی نہ دیکھنے کا تقاضا بھی پورا کرتی ہے۔ خودی کبھی دوسرے کو مقصود بنا کے focus کرتی ہے اور عین اُسی حالت میں آپ اپنا مطلوب بن کر رہتی ہے۔ یہ ذرا نچلے درجے پہ ہے لیکن بہرحال یہ سمجھنے کے لیے

کارآمد ہوا۔ ''سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند''۔ یہاں اِک بوند پانی کہا ہے خودی، ایک بوند پانی خودی اور جلوت وخلوت میں تو پوری کائنات سب کچھ آ گیا کہ یہ سمندر ہے۔ سمندر کیا ہے جس کی گہرائیوں میں ان دیکھا پن مکمل ہوجاتا ہے۔ جس کی مواجی میں بینائی صرف ہوجاتی ہے۔ یہ یادرکھیے گا۔ تو اب کہہ رہے ہیں کہ یہ سمندر جس کا نہ دیکھا جانا بھی ضروری ہے اور جس کا نظارہ بھی لازمی ہے۔ یہ پورا سمندر اپنی اس paradoxical بناوٹ میں خودی کے ایک نقطے میں گم ہے۔ یعنی وجود اپنی تمام کائناتی اور انفسی تفصیلات کے ساتھ خودی کے نکتے میں سمایا ہوا ہے۔

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا، من و تو سے پاک

یہ خودی کے بارے میں دوسرا مکمل ترین مصرع ہے۔ من وتو سے پیدا، من وتو سے پاک۔ اندھیرا اُجالا کیا ہے۔ اندھیرے میں بھی روشن ہے اور اُجالے میں بھی روشن ہے۔ تو یہ اندھیرا اور اُجالا علامتی اور رمزیہ ہے، یہ کیا مطلب ہوا۔ اندھیرا جو ہے وہ غیاب کا ہے، اُجالا جو ہے حضور کا ہے۔ تو کہہ رہے ہیں کہ حضور ہو یا غیاب، یہ اپنے وجود کو ہر جگہ ممتاز، منفرد اور روشن رکھتی ہے۔ وہی مضمون آ گیا ''من وتُو سے پیدا۔ من وتُو سے پاک'' اس میں پورا نظریۂ خودی ہے کہ خودی من وتُو میں ظاہر بھی ہے اور من وتُو سے پاک بھی ہے۔ خودی، من کی بنیاد ہے اور خود من نہیں۔ یعنی خودی مایۂ انیت ہے، تشخص اور احساسِ ذات ہے، ذات نہیں ہے۔

من وتُو، تُو بھی من ہی ہے کہ میں اور تُو ایک دوسرے سے جو ممتاز ہیں تو یہ خودی کے اُصول پہ ممتاز ہیں۔ خودی کے اُصول پہ مَیں مَیں ہوں، تُو تُو ہے ہمارا امتیاز خودی کے اصل پر ہے لیکن خودی نہ مَیں ہے نہ تُو ہے کہ مَیں اور تُو دونوں خودی کے قوام سے بنے ہیں اور اسی وجہ سے مَیں مَیں ہوں اور تُو تُو ہے کہ تُو مَیں نہیں اور مَیں تُو نہیں، یہ خودی کے قوام سے ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہمارا ایک دوسرے سے منفرد اور ممتاز ہونا ممکن کس بنیاد پہ ہے، خودی کی بنیاد پر۔ تو کہہ رہے ہیں لیکن خودی جس نے مَیں کو مَیں اور تُو کو تُو بنایا ہے وہ نہ مَیں ہے نہ تُو ہے کیونکہ وہ اُصول ہے۔

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

جیسے پہلے بتا دیا کہ من وتُو خودی کے مظاہر، آثارِ ظہور ہیں اور خودی اصل اُصول ہونے کی وجہ سے منصۂ ظہور سے بلند ہے۔ زمان و مکان سے ماورا، قیود زمانی اور حدود زمانی سے آزاد اور منزہ۔ کیونکہ اب وجود اور زمان کا مبحث مذکور ہے تو زمان سے متعلق اصطلاحیں لا رہے ہیں۔ ازل اور ابد ورائے زمان

ہونے کی اصطلاحیں ہیں۔''ازل اس کے پیچھے ابد سامنے''۔ پیچھے یعنی یہ خود ازل کے بعد ہے۔تو یہ گویا انسانی خودی۔ یہ انسانی خودی کو کیسے کہہ دیا۔تخلیق و آفرینش کا نظام ہے، الوہی تدبیر ہے۔اس کے دو حصے ہیں ایک قبل از زمان اور دوسرا بعد از زمان۔تو خودی مخلوق ہے لیکن یہ قبل از زمان پیدا کی گئی ہے۔ازل اس کے پیچھے ہے یعنی اس کی پیٹھ ازل سے لگی ہوئی ہے۔اس نے ازل کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ یہ زمانے سے پیدا نہیں ہوئی۔اس کو ازل نے پیدا کیا ہے، زمانے نے نہیں۔یعنی یہ وہ مخلوق ہے جسے اللہ نے زمان سے بھی پہلے خلق فرمایا تھا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان کی جملہ مادیت کے باوجود، انسان کی زمانیت اور مکانیت کے باوجود، انسان کی حقیقت یعنی اس کی خودی غیر زمانی اور غیر مکانی ہے کیونکہ اللہ نے اسے زمان و مکان سے پہلے پیدا کیا تھا''نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے'' اپنی حقیقت کے اعتبار سے ماورا ہے، ایک ازلی مخلوق جو ابدیت کے راستے پر چل رہی ہے یعنی خودی۔اب اس کا تاریخی بیان ہوگا:

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

عجیب طرح کا گریز ہے۔ دیکھیں ایک آدمی گریز اس طرح کر رہا ہے کہ گریز کرنے کے لیے کوئی ایک شعر بیچ میں ضائع نہیں کر رہا۔اب آپ ذرا غور کیجیے کہ ماورائے زمانیت کا وصف رکھنے کے بعد اب خودی اپنے ظہورِ زمانی یا زمانی اسلوب وجود میں ہے یعنی اب وہ زمانے میں ہے۔زمانے سے بڑی ہونے کے باوجود زمانے میں ہے تو زمانیات کے قانون اس پر بھی لاگو ہوتے ہیں تو 'زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی' یہ ہم معنی ہیں۔ پہلا شعر کیفیت کا ہے کہ آپ کیفیت محسوس کرلیں۔اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے۔''تجسس کی راہیں بدلنا'' کیا ہوا؟ سوچیے، ذرا غور کیجیے۔اس میں تو کوئی ابہام نہیں ہے کہ سامنے کا منظر ہے، راہ بدلنا بھی ہمیں معلوم ہے، تجسس بھی ہمیں معلوم ہے، خودی تجسس کی راہیں بدلتی جا رہی ہے۔تجسس کا کیا مطلب ہے۔ بنیادی تجسس ایک ہے وہ تجسس ہے حق یا حقیقت تک پہنچنا اور اس میں ڈھلنا۔ یہ خودی کا بنیادی تجسس ہے۔اس تجسس کی راہیں وہ بدلتی رہتی ہے۔کبھی شاعری سے، کبھی سائنسدان بن کے، کبھی صوفی بن کے، کبھی مزدور بن کے، کبھی دہقان بن کے۔ یہ اس حقیقت کی تلاش میں ہر صورت سے گزرتی ہے۔اس سے زیادہ بامعنی اگلا مصرع ہے۔'یہ دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی'۔ پہلے مصرعے کو ذہن میں رکھیے کہ خودی تجسس کے راستے بدلے چلے جا

رہی ہے اور ہر پل نگاہ بھی بدل رہی ہے، اپنے دیکھنے کو بھی بدل رہی ہے، یہ کیا چیز ہے؟ دیکھنا ہی نگاہیں بدلنے سے عبارت ہے کہ اس کے دیکھنے کا عمل ہی نگاہ کی مسلسل تبدیلی سے پیدا ہوتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ہمارے دیکھنے کا عمل ہے نظر کا ٹکنا۔ تو کہہ رہے ہیں خودی کا نظامِ بینائی اور اسلوبِ دید یہ ہے کہ یہ دیکھتی ہے اور نہیں بھی دیکھتی۔ یہ دیکھ دیکھ کر نہیں دیکھتی، یہ نہیں دیکھ دیکھ کر دیکھتی ہے۔ اس کی خلقت بینائی میں بدلنا داخل ہے۔ یہ جس پڑاؤ کو چھوڑتی ہے اس کو بھی اندر تک کھنگال لیتی ہے۔ اس کی خوئے حرکت کی وجہ سے اس میں دکھائی دینے والی کوئی بھی شے اس کی منزل نہیں بن سکتی۔ نگاہیں بدلتی ہوئی کا مطلب یہ ہے کہ ہر آں ایک نئی صورت پر نظر جماتی ہے۔ کبھی اُسے دیکھ کر، کبھی اسے پیدا کر کے۔ یہ سب ملا لیجیے گا۔ اب یہ تجسس کی راہ نکل آئی۔ تجسس کسے کہتے ہیں کچھ جاننے کے لیے دیکھنا۔ تو یہ اس کا کام کیا ہے کچھ جاننے کے لیے دیکھتی ہے اور دیکھ کر، جان کر پھر آگے بڑھ جاتی ہے، پھر کسی اور چیز کو کچھ جاننے کے لیے دیکھتی ہے۔ یہ ہے اس کا نظامِ حرکت۔

سبک اس کے ہاتھوں سے سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

یہ تاثراتی شعر ہے۔ یہ آپ سمجھیں کہ اس کو بس سنتے جایئے اور جوش محسوس کریں۔ یہ جوش محسوس کرنے کے لیے بھاری پتھر اس کے ہاتھوں میں تنکا ہے۔ پہاڑ اس کی ضرب کے آگے ریت بن جاتا ہے۔ اس میں ایک بات ہے۔ ان دو اوصاف میں کوئی فرق ہے کہ میں کہوں کہ اس کے ہاتھ بڑے سے بڑا وزن اُٹھا سکتے ہیں اور کہوں کہ اس آدمی کی ضرب سے پہاڑ چورا ہو جاتا ہے۔ یہ دو آدمی مختلف انداز کے ہوں گے۔ طاقت تو چلیے مشترک ٹھہری مگر اپنے طور اور ڈھب کے اعتبار سے یہ دو آدمی مختلف ہوں گے۔ ایک جو پہاڑ کو ریت بنا دیتا ہے، دوسرا پہاڑ کو آسانی سے اُٹھا لیتا ہے۔ خودی ذمہ داری اور طاقت کا نام ہے۔ آپ کبھی غور سے دیکھیے گا۔ اقبال کے ہاں خودی کی تفصیل ذمہ داری اور قوت ہے۔ تو خودی کے یہ دو بنیادی پہلو بتاتے ہیں کہ سنگِ گراں سبک ہے، اس کی ضرب سے پہاڑ ریگ رواں ہے۔

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کہ اس کا انجام بھی ایسا نہیں ہے جو پڑاؤ بنے، اس کا آغاز بھی ایسا نہیں ہے جہاں پہلے سے یہ موجود نہ ہو۔ یہ اپنے آغاز سے پہلے موجود ہے، اپنے انجام کے بعد بھی جاری رہے گی۔ تو یہ گویا ہستی کے ایک ماورائے زمان و مکاں سیل میں سب سے اونچی موج کی طرح ہے۔ 'سفر اس کا انجام و آغاز ہے'۔ کوئی کہے آپ کا

انجام سفر ہے۔اس جملے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔یعنی آپ کی منزل سفر ہے، اس کو کیسے سمجھیں گے۔اس کو یوں سمجھیں گے کہ آغاز وانجام کا تصور زمانے نے قید کر رکھا ہے۔تو زمانے کی سطح سے اوپر اُٹھ کے ہستی کی دیگر قوتیں ایسی ہیں جن کے لیے سفر ہی منزل ہے جو اپنے ہر سفر کے آغاز سے پہلے مسافر کے طور پر موجود ہیں اور جو اپنی منزل کی آخری حد تک پہنچ کر بھی اپنا مسافر رہنا برقرار رکھے۔مطلب اس نے مقیم کے طور پہ، مقیم سے مسافر نہیں بنی ہے، اسے مسافر کی حیثیت سے بنایا گیا ہے سفر کی ذمہداری دے کر۔سفر ہی اس کی حقیقت ہے، سفر ہی اس کی ذمہ داری ہے۔یہی اس کی تقویم کا راز ہے۔

کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

کرن چاند میں ہے کہ چاند کا کل امکان خودی ہے۔سنگ کا کل امکانات خودی ہے۔یعنی یہ جمال کی بھی اصل ہے اور غیر جمال کی بھی اصل ہے۔یہ سنگ گویا صلابت اور جلال ہے۔کہ کائنات بھی جلال و جمال ہے خودی اس کی اصل ہے۔اس میں ایک اُصول اور روح کے طور پر سمائی ہوئی ہے لیکن اس میں صرف نہیں ہوئی بلکہ اس سے تنزیہ کی حالت میں بھی موجود ہے۔جیسے ہم پہلے کہتے آئے ہیں۔تو اقبال کہہ رہے ہیں یہ خودی کائنات میں ہوتے ہوئے بھی کائنات سے ماورا ہے۔زمانے میں رہتے ہوئے بھی زمانے سے ماورا ہے، یعنی یہ بے رنگ ہے۔ڈوب کر رنگ میں، کا مطلب یہ ہے کہ بے رنگ ہے یعنی ماورا ہے۔رنگ میں یعنی کائنات میں۔یہ تمام چیزیں اسی کے مظاہر ہیں اور یہ کہ ہر چیز سے ماورا ہیں۔

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

کہ یہ سب تو دنیا کے قاعدے قانون ہیں کہ یہ چیز کم ہے یہ چیز زیادہ ہے۔یہ نیچی اونچی، یہ آگے پیچھے، یہ تو دنیا کے قوانین ہیں۔یہ دنیا کے قوانین کی مصنف ہے اس کی پابند نہیں ہے۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

اب پتا چلا کہ یہ اصل خودی ہے۔انسانی خودی نہیں اصل خودی ہے۔اب یہ کہہ رہے ہیں کہ کیونکہ خودی اپنی بناوٹ ہی میں کش مکش کا نام ہے، اپنی چاہت ہی میں حرکت اور انقلاب کا نام ہے تو ازل سے یہ اس کش مکش میں تھی اور اس کو اپنا گھر نہیں مل رہا تھا، اس کو اپنا آئینہ نہیں مل رہا تھا۔تو پھر یہ خاکِ آدم میں آ کر صورت پذیر ہوئی یعنی ظاہر ہوگئی۔تو اب یہ کہہ رہے ہیں کہ خودی اپنے مظہر کی تلاش کی وجہ سے کش مکش میں اسیر تھی۔تو

جب خاکِ آدم گندھ گئی تو اس نے گویا اپنے مظہر کو پالیا۔ اپنے اظہار کے ذریعہ کو ڈھونڈ لیا۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

''سمندر ہے اِک بوند پانی میں بند'' اس کی تکنیک کو یہاں مکمل کر دیا کہ خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے خودی کسی شے میں نہیں ہے اس کا پڑاؤ قلبِ آدم ہے۔ اور حقیقتِ خودی کا تعلق اسی طرح کا ہے جس طرح کہ آسمان اور آنکھ کا ہے، کہ آسمان آنکھ میں دل میں سما جاتا ہے اسی طرح خودی اپنی شان اور اپنی حقیقت کے ساتھ انسانی دل میں اپنی گنجائش پیدا کرتی ہے۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات وحواشی

۱- مولانا روم نے فرمایا ہے کہ:

اتصال بے تکیف بے قیاس
ہشت رب الناس را با جانِ ناس

۲-

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات
فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات
خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات!

۳-

عقل گوید شش جہت است و دگر راہ نیست
عشق گوید راہ ہست و رختِرام من با رہا